قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی

1989

اس شمارہ میں

۱۔ لمعات :۔ نفاذ شریعت یا قیام دین الحق

۲۔ شادی۔ ضرورت یا مجبوری

۳۔ عید الضحےٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

انسانوں نے قرآنِ کریم کی روشنی سے بہت تھوڑے سے وقت کے لئے راہنمائی حاصل کی اور اس کے بعد اس شمع نورانی پر انسانی تصورات اور خود ساختہ معتقدات کے ایسے دبیز پردے پڑنے شروع ہو گئے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کی روشنی ان پردوں کے نیچے یکسر گم ہو کر رہ گئی۔ یہ حالت صدیوں سے چلی آ رہی تھی کہ ہمارے زمانے میں بعض سعید روحوں نے اس شمع حقیقت سے انسانی تخیلات و معتقدات کے پردوں کو اٹھانے کی کوشش کی تا کہ اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی دنیا، اس دانشِ نورانی سے پھر سے راہنمائی حاصل کر سکے۔ ان میں بعض حضرات تو وہ تھے جنہوں نے قدامت پرست، مذہبی حلقہ کو خصوصیت سے مخاطب کیا اور ان غلطیوں کو ایک ایک کر کے گنایا جن کی وجہ سے وہ قرآن سے اس قدر دور ہو چکے تھے اور بعض وہ جنہوں نے آنے والی نسل کے رجحانات ومیلانات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کر کے اسے بتایا کہ عصرِ حاضر کے تقاضے کیا ہیں اور قرآنِ کریم کس طرح ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح انہوں نے کوشش کی کہ ہمارا نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ قرآن کے قریب آ جائے اور اس شمع نورانی کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے۔ اول الذکر طبقہ میں علامہ اسلم جیراجپوریؒ کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے اور ثانی الذکر میں علامہ اقبالؒ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

محترم پرویز صاحب نے ان دونوں گروہوں کی بصیرتِ قرآنی سے کسب ضیا کیا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کی نگاہ قدیم پر بھی تھی اور جدید پر بھی۔ انہوں نے اسلام کی تاریخ کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں پر بھی وسیع نظر رکھتے تھے۔ ان کی ساری عمر قرآن کے مطالعہ میں گزری اور قرآنِ کریم کے ساتھ ان کی والہانہ گرویدگی اور عشق کا نتیجہ تھا کہ قرآن ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر ان کے افقِ ذہن پر چھا گیا۔

غلام احمد پرویزؒ (رحمۃ اللہ علیہ) کی ولادت باسعادت مورخہ ۹ جولائی ۱۹۰۳ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ آج آپ کی پیدائش کو ایک سو ایک واں سال پورا ہونے کو ہے۔ آپ کے دادا مولوی، چوہدری، رحیم بخشؒ حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک ممتاز بزرگ ہونے کے علاوہ ایک ماہرِ طبیب اور سنسکرت کے عالم تھے۔ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کی ابتدائی تربیت اپنے دادا کی زیرِ نگرانی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کی نگاہ کی مشرقی مغربی افقین کافی وسیع اور ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں کافی عمیق ہو چکی تھیں۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد سول سروس میں چلے گئے اور ۱۹۵۴ء میں جب کہ آپ وزارتِ داخلہ میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تا کہ اپنے قرآنی مشن کو پورا وقت دے سکیں۔

اس دوران میں آپ کی زندگی علمی معرکہ آرائیوں سے عبارت رہی۔ ۱۹۳۲ء میں ابوالکلام آزاد کے تفسیری ترجمہ (ترجمان القرآن) کی پہلی جلد شائع ہوئی۔انہوں نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلے میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں۔لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِنو اختیار کرلیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔

پرویز علیہ الرحمۃ کی بصیرتِ قرآنی کے مطابق یہ نظریہ' اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔یہ برہمو سماج کی تعلیم تو ہوسکتی ہے قرآن کی نہیں۔اس لئے آپ نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) کی جنوری ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت تا بہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جراَتِ ایمانی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

۱۹۲۶ء میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کرنے سے مرتد ہو گیا ہے۔لہٰذا اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخرالامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔یہ فیصلہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں بالوضاحت کیا تھا۔اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔بعد میں آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت'' ۱۹۷۴ء میں شائع کی۔

علامہ اقبالؒ کے خاکہ کے مطابق جناب پرویزؒ نے سلسلہ ''معارف القرآن'' کی ابتدا ۱۹۲۸ء میں کی۔پہلی جلد کا عنوان تھا۔''اللہ'' جو بعد میں ''من و یزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔پھر ''ابلیس و آدم'' تحریر کی جس میں آدم۔ابلیس۔ملائکہ۔جن۔شیطان۔وحی۔رسالت وغیرہ عنوانات پر قرآنی تصریحات پیش کی گئیں۔معارف القرآن کی تیسری جلد ''جوئے

نور''۔ چوتھی جلد ''برقِ طور'' اور پانچویں جلد ''شعلہ مستور'' حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء کرامؑ کے حالاتِ زندگی کو محیط ہیں۔ پھر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ۔ بعنوان ''معراجِ انسانیت'' شائع کی۔ وحی کی ضرورت اور اہمیت اجاگر کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سال کی فکری کاوشوں کا نچوڑ۔ ''انسان نے کیا سوچا'' کے عنوان سے ایک کتاب میں پیش کیا۔ جس کو پڑھنے سے یہ حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ عقل انسانی۔ انسانی مسائل کو حل کرنے میں کس طرح ناکام رہی ہے اور پھر یہ بتانے کے لئے کہ وحی کی رو سے انسانی مسائل کا حل کیا ہے آپؒ نے ایک کتاب بعنوان ''اسلام کیا ہے؟'' شائع کی۔ معاشی مسئلہ ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ معاشی نظریات کی بنیاد پر دنیا دو بڑے بلاکس میں منقسم ہے۔ اس مسئلہ کے قرآنی حل کو پیش کرنے کے لئے آپ نے متعدد تقاریر کیں اور مضامین شائع کئے جن میں سے کچھ ''خدا اور سرمایہ دار'' نامی کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط تصنیف ''نظام ربوبیت'' شائع کی۔

تقدیر کا مسئلہ صدیوں سے الجھا چلا آ رہا ہے۔ اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے آپؒ نے ''کتاب التقدیر'' تحریر کی۔ آخرت کے متعلق قرآنی توضیحات کو ایک کتاب بعنوان ''جہان فردا'' میں شائع کیا اور اس طرح قریب چالیس سال کی محنتِ شاقہ سے سلسلہ معارف القرآن کو تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی کتاب فجر الاسلامؔ میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دیگر قوموں کے تصورات کس طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے گئے اور یوں قرآن کے تصورات کی جگہ غیر قوموں کے تصورات نے لے لی۔ چنانچہ آج جسے مذہبِ اسلام کہا جاتا ہے یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں سے مستعار تصورات کا جن پر لیبل قرآنی اصطلاحات کا لگا دیا گیا ہے۔ ان تصورات سے اور تو اور عربی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآن حکیم کے الفاظ کا کوئی ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں نہ صرف الفاظ کے وہ معنی دیئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے۔ بلکہ ان الفاظ کے پس منظر میں قرآنی تصورات کی بھی وضاحت کی جائے۔۔۔ یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا' لیکن اگر انسانوں کی ایسی جماعت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لئے استعمال کئے۔

سلسلۂ معارف القرآن اور لغات القرآن کے علاوہ جناب پرویزؒ نے ''مفہوم القرآن'' تین جلدوں میں مرتب کیا۔ قریب ڈھائی ہزار عنوانات کے تحت قرآنی مضامین کو مرتب کر کے ''تبویب القرآن'' شائع کی اور سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) اور ''طاہرہ کے نام خطوط'' قرآنی تعلیمات پر مشتمل ادب پارے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اسلامی معاشرت اور پھر قرآن کے بیان کردہ قوانین۔ بعنوان ''قرآنی قوانین'' اور انگریزی زبان میں کتاب۔۔۔ Islam a Challenge to Religion اس پر مستزاد ہیں۔ غرض کس کس کاوش کا ذکر کیا جائے۔

ان علمی کارناموں کو سرانجام دینے کے علاوہ آپ نے تحریک پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل ۱۹۳۸ء سے مئی ۱۹۴۲ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد جریدہ تھا جس نے تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جا سکتی۔

قائداعظمؒ پروٹوکول کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ انہیں کوئی شخص پیشگی وقت لئے بغیر نہیں مل سکتا تھا لیکن یہ شرف جناب پرویزؒ کو حاصل تھا کہ آپؒ کسی بھی وقت قائداعظمؒ سے ملاقات کر سکتے تھے۔ باوجود اتنے قریب ہونے کے جناب پرویزؒ نے کبھی اس بات کو فخریہ بیان نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان بن جانے پر کوئی مراعات حاصل کیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء میں آپؒ نے دوبارہ طلوع اسلام شائع کرنا شروع کیا۔ جو باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے دشمن عناصر بھی یہاں ہجوم کر کے آ گئے اور یہاں آ کر پر پرزے نکالنے لگے۔ اب ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم اگر پاکستان بن ہی گیا ہے تو اس میں وہ نظام نہ رائج ہونے دیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ اسلام کی آڑ میں یہاں تھیاکریسی رائج کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اب دوبارہ جناب پرویزؒ کو ان کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا۔ قرارداد مقاصد اور علماء کے بائیس نکات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن پر جناب پرویزؒ نے تفصیلی تنقید کی۔ آپؒ نے تفصیلاً بتایا کہ جسے علماء سنت کہتے ہیں وہ نہ تو متفق علیہ ہے کہ اس کی رو سے کوئی متفق علیہ قانون مرتب کیا جا سکے۔ علماء کا سنت پر اس قدر زور دینا محض اس لئے ہے کہ یہاں قرآنی نظام رائج نہ کیا جا سکے۔ مخالفین سے آپؒ کے پرزور دلائل کا جواب تو بن نہ پڑا انہوں نے آپؒ کے خلاف فتویٰ کفر دے دیا جس پر ایک ہزار علماء کے دستخط ثبت تھے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہے اور ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کو شام چھ بجے آپؒ اس دار فانی سے انتقال فرما گئے۔

کل من علیھا فان o و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام o (55:26-27)

اللہ تعالیٰ جناب علامہ پرویزؒ کو اپنے سحابِ کرم سے نوازے۔ آمین

کون جانے اس پائے کی شخصیت پھر کب پیدا ہوتی ہے۔

کیونکہ ؎

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید اقبال ظفر علوی

ذکرِ پرویزؒ

پرویز مرحوم علمی اور دینی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ ادارہ طلوع اسلام کے بانی تھے۔ آپ نے قائداعظمؒ کے ایماء پر ۱۹۳۸ء میں ''طلوع اسلام'' رسالے کا اجراء کیا۔ اس کا مقصد تحریکِ پاکستان اور دوقومی نظریے کی تائید وحمایت کرنا اور اس کے مخالفین کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس روز سے لے کر مرتے دم تک پرویز صاحب دوقومی نظریے کی تشریح اور اسلام کی تبلیغ میں ہمہ تن مصروف رہے۔ علاوہ ازیں آپ کو نہ صرف یہ کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں سے قرب حاصل رہا۔۔۔ بلکہ آپ ان چند خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جو قائداعظمؒ سے وقت (Appointment) لئے بغیر مل سکتے تھے۔ ا؎

تحریکِ پاکستان کے ایک سرگرم کارکن ہونے کے علاوہ آپ ایک جید عالم دین اور نامور مفکر بھی تھے۔ آپ نے اسلام پر پچاس سے زائد کتب تصنیف کیں۔ پرویز صاحب کی تمام تر دیدہ ریزیوں اور جگر سوزیوں کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ مذہب' انسان اور خدا کے درمیان محض ایک نجی تعلق کا نام ہے اور اس کو عملی زندگی اور اس میں درپیش مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ بڑی حد تک یہ رسوم کا مجموعہ ہوتا ہے۔۔۔ اس کے برعکس دین ایک نظامِ حیات کا نام ہے۔ یہ زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ خواہ مسائل سیاسی ہوں' معاشرتی ہوں یا معاشی ہوں یہ ان تمام کا حل پیش کرتا ہے۔ اور یہی چیز اسلام کو دیگر مذاہب عالم سے ممتاز کرتی ہے۔ دین اسلام کی کوئی بھی ایسی تعبیر و تشریح جو ان مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو جائے' اس دین کو مذہب بنا دینے کے مترادف ہے۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج' یہ تمام چیزیں رسوم نہیں کہ ان کو صرف ظاہراً ادا کر دیا جائے تو دین کا مدعا پورا ہو جائے گا۔ بلکہ ان ارکان کی غرض و غایت اصل چیز ہے۔ یہ ظاہری اعمال ضروری ہیں لیکن مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی ارفع مقصد کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔۔۔ اگر غرض و غایت باقی نہ رہے تو اسلام رسوم کا گہوارہ بن جائے گا۔ دین کی بجائے مذہب بن جائے گا۔ مثلاً صلوٰۃ کا مقصد مسلمانوں میں اتحاد' مساوات اور یک نگہی پیدا کرنا اور تفرقے کو مٹانا ہے۔ نیز اس چیز کا اقرار کرنا ہے کہ ہم عملی زندگی میں بھی اللہ کے احکام وقوانین کی اطاعت کریں گے۔ سجدہ و رکوع اسی چیز کے مظہر ہیں' غرض' نماز اطاعتِ خداوندی کی سمٹی ہوئی شکل (Minature Form) ہے۔ اگر عملی زندگی میں قوانینِ خداوندی کا اتباع نہیں کیا جاتا تو یہی نماز رسم بن کر رہ جاتی ہے۔

اسی طرح ان کا کہنا تھا کہ زکوٰۃ کی کوئی بھی ایسی تعبیر و تشریح جو لوگوں کے معاشی مسائل حل کرنے سے قاصر رہے' صحیح نہیں ہوسکتی۔ آپ نے عمر بھر اسلامی حکومت کی معاشی ذمہ داریوں پر ازحد زور دیا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ عوام کی معاشی کفالت اسلامی حکومت کی صرف ایک خاصیت ہی نہیں بلکہ یہ اسلامی حکومت کا طرۂ امتیاز ہے۔ پرویز صاحب عمر بھر قرآنِ پاک' سیرتِ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہؓ کے ذریعے اس معاشی ذمہ داری کی بھرپور تشریح کرتے رہے۔ آپ نے سیرتِ فاروقؓ پر ایک قابل رشک کتاب ''شاہکار رسالت'' تصنیف فرمائی جس میں انتہائی رعنائی کے ساتھ حضرت عمر فاروقؓ کے طرزِ حکومت کے ذریعے اسلامی مملکت کی معاشی اور دیگر ذمہ داریوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

دین کے فہم کے سلسلے میں پرویز صاحب' علامہ اقبالؒ سے بے حد متاثر ہوئے۔ آپ اقبالؒ کو اپنا عظیم محسن سمجھتے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پرویز صاحب اقبالؒ کے مستند شارح کی حیثیت

ا؎ یہ بات قائداعظم محمد علی جناح کے صد سالہ جشن و پیدائش کے سلسلے میں مولانا کوثر نیازی نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہی تھی اور یہ بات اگلے روز اخبارات میں بھی آ گئی تھی۔

رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کی کتاب ''اقبال اور قرآن'' ایک زندۂ جاوید شاہکار ہے اور اس کی توصیف کے لئے میں اپنی زبان کو عاجز پاتا ہوں کہ محض ستائش کے الفاظ اس کتاب کے حسن کی کما حقہ عکاسی نہیں کر سکتے۔ پرویز صاحب جہاں فکر قرآنی کا ذکر کرتے۔ وہاں اقبالؒ کا ذکر ضرور آتا۔ اور جہاں اقبال کا ذکر آتا وہاں قرآن کا ذکر ضرور ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ فکر اقبالؒ کا سرچشمہ قرآن تھا اور اقبال کو وہی سمجھ سکتا ہے جو قرآن پر گہری نظر رکھتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ اور پرویز صاحب کے نظریات میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔

اگر آپ علامہ اقبالؒ اور پرویز صاحب کے، قوانین سازی، معاشی نظام اور تقدیر کے بارے میں نظریات کو یک نظر دیکھیں تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ دونوں کے خیالات میں کس قدر اشتراک پایا جاتا ہے۔۔۔ اس کی وجہ فقط اور فقط یہ ہے کہ ان دونوں کی فکر کا سرچشمہ قرآن تھا..........۔

یہاں ایک اور گوشے کی طرف توجہ دلانا گزیر ہے۔ وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ اقبالؒ سے پرویز صاحب کو والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ ان سے گہرا ذہنی اور قلبی لگاؤ تھا۔ جہاں بھی انہوں نے محسوس کیا کہ اقبالؒ کی فلاں بات خلاف قرآن ہے' آپ نے نہ صرف اس سے اختلاف کیا بلکہ اس پر بھرپور تنقید بھی کی۔ کیونکہ ان کے نزدیک دین میں کسی انسان کو سند و حجت حاصل نہیں ہے۔ اقبالؒ بھی بالآخر انسان تھے وہ غلطی کر سکتے تھے۔ پرویز صاحب نے تصوف کے موضوع پر ایک کتاب ''تصوف کی حقیقت'' تصنیف کی جس میں انہوں نے باقاعدہ ایک باب ''اقبالؒ اور تصوف'' کے عنوان سے مختص کیا ہے۔ اس باب میں اقبالؒ کے کچھ اشعار و خیالات پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ تصوف کے متعلق اقبالؒ کے نظریات ہمیشہ ہی متنازعہ رہے ہیں۔ کسی زمانے میں وہ تصوف کے دلدادہ تھے۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ وہ اس کو مسلمانوں کے زوال کا سبب سمجھنے لگے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ''تصوف شعبدہ بازیوں کی کمند'' جیسا مضمون تحریر کیا اس کے علاوہ وہ تصوف کو اسلام کی سرزمین میں ''اجنبی پودا'' کہا کرتے تھے اور اس کے بعد عمر کے آخری حصے میں پھر اسی طرف آ گئے.......... بہرحال یہ پرویز صاحب کی دیانتداری کی دلیل ہے کہ انہوں نے اگر اقبالؒ کی بات بھی غلط سمجھی تو اس پر بلا جھجک تنقید کی۔

پرویز صاحب تمام عقائد و نظریات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کے قائل تھے۔ بعض سطح بیں لوگ اس کو انکار حدیث پر محمول کر لیتے ہیں۔ لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں۔ اصل حقیقت یوں ہے کہ نظریات وعقائد تو قرآن ہی کے عطا کردہ ہیں' حضور پاک ﷺ یا صحابہ کرامؓ نے کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ امت کو نہیں دیا بلکہ قرآن ہی کے عطا فرمودہ نظریات' عقائد و احکام کی تشریح کی ہے۔ آپ نے احادیث اور مسلمانوں کی تاریخ کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھا اور ایسی ہر روایت اور بیان کو وضعی قرار دیا جو قرآن کریم کے خلاف جاتا ہو یا جس سے ذات رسالت مآب ﷺ یا حضرات صحابہ کرامؓ کی ذات پر طعن وارد ہوتا ہو۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرت مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے' انہیں وہ صحیح مانتے تھے۔ اس بات کی شہادت ان کی تمام کتابوں میں ملتی ہے۔ تحقیق کی خاطر ''شاہکار رسالت'' ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

پرویز صاحب کہا کرتے تھے کہ دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین متمکن نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا یہ نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا یہ نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد

منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے۔ آج اگر ایسی خلافت یا اسلامی حکومت قائم ہوتو اس کے پیش نظر بھی قانون سازی کا وہی اصول ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہٗ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی وہ احکام وقوانین جو قرآن کریم میں مذکور ہیں ان کی اطاعت کرائی جائے گی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی جزئیات قرآنی اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ملت کے مشورہ سے طے کی جائیں گی۔ اس سلسلے میں حضور پاکؐ یا خلفائے راشدینؓ کے دور کے وہ فیصلے یا جزئیات جو اس زمانے کے حالات سے مشروط تھیں، خلافت علیٰ منہاج نبوت انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کرسکتی ہے، لیکن یاد رہے کہ ایسا کرتے وقت قوانین کی روح تو بدستور قائم رہے گی۔ صرف جزئیات تبدیل ہوں گی۔ بالفاظ دیگر قوانین اسلام میں قانون ثبات وتغیر Law of Permanence and change کارفرما ہوگا۔ جس میں ثبات اصولوں کو حاصل ہوگا اور تبدل جزئیات کو۔ اس کے علاوہ اسلامی حکومت، قرآن اور پچھلے دور میں کئے گئے فیصلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئے فیصلے بھی کرسکتی ہے .... نئے قوانین مرتب کرسکتی ہے۔ آپ اس کی تائید میں حضرت عمر فاروقؓ کے دور حکومت کو بطور مثال پیش کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضور پاکؐ کے دور میں کئے گئے فیصلوں کو برقرار رکھا لیکن ساتھ ہی جن فیصلوں کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلنا پڑا انہیں بدلا۔ نیز کئی نئے اقدامات کئے۔ اس اجمال کی تفصیل ''شاہکار رسالت'' میں ص ۲۸۰۔۲۷۷ پر ملے گی۔

پرویز صاحب کہا کرتے تھے کہ صرف اسی طرح اسلام تمام زمانوں کے لئے دین کہلاسکتا ہے اور دنیا میں نافذ ہوسکتا ہے۔ اگر ہم نے کسی زمانے میں طے کردہ جزئیات کو ناقابل تغیر سمجھ لیا تو اسلام کبھی بھی اس دنیا میں عملاً نافذ نہ ہوسکے گا۔ بطور سند تو نہیں لیکن اطلاعاً عرض ہے کہ اقبالؒ کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا۔ ملاحظہ ہو ''خطبات اقبال'' (ص ۱۶۴۔۱۶۳)۔

میں اس حقیقت کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ موضوع زیر بحث شدت سے اس کا متقاضی ہے کہ پرویز صاحب قطعاً منکر حدیث یا منکر شان رسالت نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ یہ سارا سرمایہ بیکار ہے اور وہ ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے تھے جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔ آپ نے اپنی کتب میں جابجا احادیث نقل فرمائی ہیں اور ان سے استدلال کیا ہے۔ پرویز صاحب نے حضور پاکؐ کی سیرت پر گرانقدر کتاب ''معراج انسانیت'' تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کو حضور پاکؐ سے کس قدر محبت تھی۔ اس کتاب میں آپ نے جابجا احادیث تحریر فرمائی ہیں۔

میں پرویز صاحب کے سلسلے میں آپ کی توجہ ایک ایسے پہلو کی طرف مبذول کراؤں گا کہ آپ حیران وششدر رہ جائیں گے کہ پرویز صاحب کو رسول پاکؐ سے قلبی لگاؤ کس نوعیت کا تھا۔ ''شاہکار رسالت'' کے آغاز میں آپ نے ایک مختصر سا باب ''گذرگاہ خیال'' کے نام سے تحریر کیا ہے۔ اس میں آپ نے اپنی ابتدائی زندگی کا ہلکا سا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس میں پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا تو اس میں اس قدر غیر اسلامی نظریات وافکار کی بھرمار تھی کہ ان کے دل میں اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے اور جب آپ نے مزید مطالعہ کیا تو جوان پر گذری وہ پرویز صاحب ہی کی زبانی سنئے:

''ان حالات میں عین ممکن تھا کہ میں اسلام سے برگشتہ ہوجاتا لیکن میری انتہائی خوش بختی کہ اس ورطۂ ''لا'' میں ایسا جاذبہ موجود رہا جو ان تلاطم خیزیوں میں میری کشتی کا لنگر بن گیا اور وہ جاذبہ تھا حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس واعظم کے ساتھ میری بے پناہ عقیدت ہی نہیں محبت۔ میرا ایمان تھا کہ ایسی عظیم ہستی جس نے انسانوں کی داخلی اور خارجی دنیا میں ایسا تحیر انگیز انقلاب برپا کردیا تھا نہ تو (معاذ اللہ)

فریب خوردہ ہوسکتی ہے نہ فریب کار۔ اس لئے جب آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید نہ میری نہ کسی اور انسان کی فکری تخلیق ہے بلکہ یہ خدا کا کلام ہے تو مجھے اس دعوے کو یونہی نہیں جھٹک دینا چاہئے۔ انتظار کرنا چاہئے تا آنکہ میں قرآن کو خود سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔ بس یہ تھا ایک سہارا (اور کس قدر محکم سہارا) جس نے مجھے ان طوفانوں میں تھامے رکھا اور میرے پاؤں میں لغزش نہ آنے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے کم کشش کی کوئی قوت مجھے اس ورطہ میں سنبھال نہیں سکتی تھی۔ سچ ہے: ؎

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

کس قدر احسانِ عظیم ہے اس ذرۂ ناچیز پر اس آفتاب عالمتاب کا' جس کی رحمۃ للعالمینی کے تصدق مجھے منزل ملی' مقام ملا' مدعا ملا......''

؎

کوثر چکد از لبم' بایں تشنہ لبی
خاور دمداز شمم' بایں تیرہ شبی
اے دوست ادب' کہ درحریم دلِ ماست
شاہنشہِ انبیاءؑ رسولِ عربیؐ

ان اللّٰہ و ملٰئکتہ یصلون علی النبی۔ یایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما ((33:56۔''

یہ تھی کیفیت پرویز صاحب کے حُبِّ رسول کی۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حقیقت اور پروپیگینڈے میں کس قدر فرق ہے۔

پرویز صاحب نے اپنے خلاف برپا کئے جانے والے تمام طوفانوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ آپ کا عزم واستقلال تھا کہ آپ آخری سانس تک اسلام کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے عزم و ہمت کا اندازہ وہ لوگ اچھی طرح کر سکتے ہیں جو ان سے اسی (۸۰) سال کی عمر میں ملے ہوں یا اس دور کی کوئی تقریر انہوں نے سنی ہو۔ ان کی آواز' اندازِ گفتگو اور یادداشت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ یقین کر ہی نہیں سکتا تھا کہ آپ کی اتنی زیادہ عمر ہے۔

۱۴ اگست ۱۹۸۴ء یوم آزادی کے موقع پر میں پرویز کی تقریر سننے گیا تو وہ اس وقت بیمار تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یکا یک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے' اس میں سے ایک انتہائی ضعیف انسان نکلتا ہے۔ اس کو دو آدمیوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ وہ بمشکل تمام کرسی تک پہنچتے ہیں...... کمزوری بیان سے باہر ہے۔ لگتا نہیں تھا کہ تقریر تو کجا چند منٹ بول بھی سکیں گے...... لیکن نہیں...... تقریر شروع ہوتی ہے...... چیخنا چلانا نہیں ہے...... شور شرابا نہیں ہے...... جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا نہ جانے ہمیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ وہی دھیما انداز...... ٹھہر ٹھہر کر بولنا...... حضرتِ عمر فاروقؓ کے وہی کارنامے جو ہم ہمیشہ سے سنتے چلے آ رہے تھے لیکن نہ جانے کیا تاثیر تھی ان کے الفاظ میں...... ان کے قلب سے پھوٹنے والی وہ کون سی شعائیں تھیں جو ہمارے قلوب میں تیر کی مانند چبھتی جا رہی تھیں...... کیا بتاؤں کیوں ہم پر رقت طاری ہوتی جا رہی تھی...... کچھ معلوم نہیں کوئی پتا نہیں...... ابھی محفل پر رنگ آنے لگا تھا کہ کچھ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پرویز صاحب عرصۂ دراز تک قرآن پاک کا درس دیتے رہے اور درس دیتے وقت آپ پر اکثر رقت طاری ہو جایا کرتی تھی اور جب آپ آنسو برداشت کرنے کی کوشش کرتے تو آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور یہ چیز آپ کے باوقار چہرے کو مزید دلکش اور متاثر کن بنا دیتی تھی اور آپ کی بات تیر کی مانند دل میں اتر جاتی۔

پرویز صاحب نے اپنی ساری عمر جس کو کنی' جوئے شیر براری اور خارہ شگافی میں گزار دی آپ اس کے لئے جس انعام و صلے کے متمنی تھے' اسے انہی کی زبانی سن لیجئے:

''اگر میری ان کوششوں سے چند نفوس بھی ایسے پیدا ہو گئے جن کے دل میں قرآن کی راہنمائی کا یقین علیٰ وجہ البصیرت ابھر آیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزیوں اور جگر سوزیوں کا صلہ مل گیا۔''

(انسان نے کیا سوچا' ص ۱۰)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(محترم ایس۔ این۔ باقر صاحب، سابقہ نائب معتمد امور داخلیہ کی ایک تقریر)

اسلام نے دنیا کو کیا دیا؟

(شعبۂ فلسفہ میں)

جن مشاہیرِ سلف کے نقوشِ قدم، تاریخ کی ریگِ رواں پر، مثلِ کہکشاں درخشندہ ہیں ان میں اربابِ فکر (فلاسفرز) کا مقام بھی کچھ کم بلند نہیں۔ اسلام نے جہاں دنیا کو دیگر علوم و فنون کی برکات سے اس قدر بہرہ یاب کیا، فلسفہ کے میدان میں اس کی موہبات بھی بہت گراں قدر ہیں۔ اگرچہ عام جہالت اور مذہبی تعصب کی وجہ سے، دنیا نے اسلام کی اس احسان مندی کا اعتراف بہت کم کیا ہے۔ لیکن اب اس جہالت اور تعصب کے بادل چھٹ رہے ہیں اور رفتہ رفتہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ رہی ہے۔

اقوامِ عالم کی تاریخ میں ہوتا یہ رہا ہے کہ کبھی کبھی کچھ افراد ابھر کر سامنے آ گئے جنہوں نے محض اپنی افتادِ طبیعت کی بنا پر فلسفیانہ مباحث پر غور و خوض شروع کر دیا اور اس طرح وہ دنیا کی فکری متاع میں کچھ اضافہ کر گئے۔ یہ نہیں ہوا کہ ان کی قومی ثقافت ان کی فکری کاوشوں کے لئے محرک بن گئی ہو۔ لیکن مسلمانوں میں فلسفیانہ نہجِ فکر کی نشوونما بالکل جداگانہ انداز سے ہوتی ہے۔ ان کی فکری کاوشوں کا محرک خود ان کا آئین حیات (قرآن) تھا۔ بنیادی طور پر قرآن ایک ضابطۂ زندگی ہے جو نظریہ کی بجائے عمل پر زور دیتا ہے۔ لیکن یہ ضابطۂ زندگی علم و بصیرت پر مبنی ہے اور اس نے اپنی صداقت کے لئے استنتاجی معیار مقرر کیا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ میری دعوت الی اللہ، علیٰ وجہ البصیرت ہے اور اس کی سچائی کا ثبوت اس کے نتائج ہیں۔ جب کسی قوم کے ضابطۂ زندگی کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ علم و بصیرت پر مبنی ہے، تو اس قوم میں فکری نشوونما کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسی کا نام فلسفیانہ کاوش ہے۔

اسلام کا ابتدائی دور، عمل کا دور تھا جس میں مجرد فکر کی گنجائش یا کم از کم ضرورت نہ تھی۔ اس وقت تو یہ حالت تھی کہ ادھر ایک حکم ملا اور ادھر قوم نے اس حکم کو عمل میں متشکل کر کے دکھا دیا۔ اس وقت اس کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت کہ ان احکام کی فلسفیانہ توجیہات اور منطقیانہ تشریحات میں الجھا جاتا۔ قوم کے سامنے ایک بلند نصب العین تھا اور اس نصب العین کا حصول ہر ایک کا مطمحِ نگاہ۔ اس لئے اس وقت نظری مباحث کی کسی کو فرصت ہی نہ تھی۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

مسلمانوں کی تاریخ میں مجرد فکر کی ابتداء، عباسیوں کے زمانہ سے ہوئی۔ ہوا یہ کہ اسلام کی سادہ اور پرعمل تعلیم کی کشش سے غیر مسلم فوج در فوج حصارِ اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ اس سے

یہودی، نصرانی اور مجوسی مذاہب کے اربابِ بست وکشاد کو بڑا خطرہ لاحق ہوا کہ اگر یہ افتاد اسی طرح جاری رہی تو ایک دن ان کے مذاہب کا وجود ہی صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔ وہ عمل کے میدان میں مسلمانوں کا مقابلہ کر نہیں سکتے تھے۔ اس حقیقت سے وہ اچھی طرح باخبر تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک اور ترکیب سوچی۔ انہوں نے کہا کہ کسی طرح مسلمانوں کو نظری مباحث میں الجھا دیا جائے، اس سے ایک تو یہ ہوگا کہ ان کی توجہ عملی میدان سے ہٹ جائے گی اور دوسرے یہ کہ چونکہ نظری مباحث کا مدار منطق اور فلسفہ پر ہوگا اور مسلمان اس میدان کے شاہسوار نہیں، اس لئے ہم انہیں شکست پر شکست دیتے چلے جائیں گے۔ اسلامی سلطنت میں غیر مسلموں کو اپنے انداز پر سوچنے اور اپنی فکر کو بلاجھجک پیش کرنے کی آزادی تھی۔ اس سے انہوں نے فائدہ اٹھایا اور اسلام کے خلاف منطقیانہ اعتراضات شروع کر دیئے۔ خدا کی ذات کیسی ہے؟ اس کی ذات اور صفات میں کیا تعلق ہے۔ کیا خدا کائنات میں ہر جگہ موجود ہے یا عرش پر مکین ہے۔ روح کسے کہتے ہیں۔ ازل اور ابد سے کیا مفہوم ہے۔ وغیر ذالک، متکلمانہ مباحث کا دروازہ کھل گیا۔ شروع شروع میں تو مسلمانوں نے ان مباحث میں اجنبیت سی محسوس کی لیکن چونکہ غور وتدبر اور فکر وتعقل کی دعوت خود قرآن میں موجود تھی اس لئے انہیں اس میدان میں اترنے میں بھی چنداں دقت نہ ہوئی۔ اس زمانہ میں متکلمانہ مباحث کا ماخذ یونانی فلسفہ تھا۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے اس فلسفہ کو عربی زبان میں منتقل کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر فلسفہ کے میدان میں مسلمانوں کا کچھ اور ترکہ نہ بھی ہوتا تو بھی ان کا یہی کارنامہ کہ انہوں نے یونانی فکر کو عربی جیسی زبان میں منتقل کر دیا، بجائے خویش نہایت گراں ثمن تھا۔ لیکن فلسفۂ یونان کا عربی ترجمہ تو محض ایک ذریعہ تھا فلسفیانہ مباحث کے میدان میں اترنے کا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ان غیر مسلم معترضین سے ان تمام امور پر بحث وتمحیص شروع کر دی۔ جس گروہ نے سب سے پہلے اس نہج پر گفتگو شروع کی وہ تاریخ میں معتزلہ کے نام سے معروف ہے۔ رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ غیر مسلموں کے اعتراضات کو ختم کر کے، مسلمانوں نے خود آپس میں نظری مسائل کو متکلمانہ مباحث کا موضوع بنا لیا۔ مامون الرشید کے عہد میں اس فلسفیانہ انداز تکلم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خود مامون الرشید نے قرآن کے حدوث وقدم کی بحث اٹھائی۔ یعنی یہ بحث کہ قرآن مخلوق ہے یا ابدی۔ وہ (اور معتزلہ) ''خلقِ قرآن'' کے حامی تھے۔ چونکہ ان کی بحث زیادہ تر متکلمانہ تھی۔ اس لئے مسلمانوں کے دوسرے گروہ کو بھی، جو اس عقیدہ میں ان کے خلاف تھا، مجبوراً یہی انداز گفتگو اختیار کرنا پڑا۔ اس سے ''قدامت پسند'' طبقہ میں بھی فلسفیانہ نہج فکر کا رواج ہوگیا۔ یہی آگے چل کر اشعریہ کے نام سے معروف ہوئے۔

مسلمانوں میں فلسفیانہ غور وفکر کی ابتداء تو اس ضرورت کے ماتحت ہوئی لیکن آگے چل کر ان میں ایسے ایسے ممتاز فلاسفر پیدا ہو گئے جن کا شمار دنیائے فکر کے عمائدین میں ہوتا ہے۔ مثلاً ابو یوسف اسحٰق الکندری (پیدائش ۸۵۰ء) جس نے ارسطو کے فلسفہ کا عربی میں ترجمہ کیا۔ یا الفارابی (متوفی ۹۵۰ء) افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ پر اس کا محاکمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ الفارابی نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ ''زمان اس حرکت کا نام ہے جس سے اشیائے کائنات میں رابطہ قائم ہے۔'' الفارابی کا محاکمہ اور زمان کے متعلق یہ نظریہ صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں بطور نصاب رائج رہا۔ فارابی کے بعد شیخ ابن سینا کو دیکھئے

(۹۸۰ء۔ ۱۰۳۷ء)۔ اگرچہ شیخ کی شہرت کا خصوصی میدان، علمِ طب ہے لیکن فلسفہ کے میدان میں بھی اس کی تحقیقات کا مرتبہ ایسا بلند ہے کہ سترہویں صدی تک یورپ انہی کے نقوشِ قدم کا متبع رہا۔ بیکنؔ، جو یورپ میں استقرائی علم کا موجد تصور کیا جاتا ہے، ابن سیناؔ کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> ارسطو کے فلسفہ کا معتدبہ حصہ اہل یورپ کی نگاہوں سے مستور رہا۔ یا تو اس لئے کہ اس کے مخطوطات نایاب تھے یا اس لئے کہ یہ موضوع سخت مشکل تھا۔ حتیٰ کہ ابن سینا اٹھا اور اس نے اس کا سارا فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

بغداد کی تباہی کے بعد مسلمانوں کی علمی کاوشوں کا مرکز ہسپانیہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ اندلسی مفکرین میں ابن مسرہؔ (۸۸۳ء) کا نام السابقون الاولون میں ہے۔ دسویں صدی میں اس کا فلسفہ نہ صرف ہسپانیہ بلکہ فرانس اور اٹلی تک افق ذہنی پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے بعد، ابن طفیلؔ کو دیکھئے جس کی عظمت کسی تعارف کی محتاج نہیں اور پھر ابن رشدؔ (۱۱۲۶۔ ۱۱۹۸ء) جسے اہلِ یورپ، کم از کم اٹھارہویں صدی تک فلسفہ کا امام تسلیم کرتے رہے ہیں۔ سنٹرل ایشیاء کے مفکرین میں امام غزالیؔ (۱۰۵۸۔ ۱۱۰۹ء) کا نام بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ امام غزالیؔ فی الحقیقت بحر العلوم تھے۔ شروع میں یہ خود فلاسفر تھے لیکن آخری عمر میں انہوں نے وہی دلائل جو کبھی فلسفہ کے حق میں دیئے تھے، خود فلسفہ کے خلاف استعمال کئے اور ان کے زور پر تصوف اور دینیات کو بہت آگے بڑھایا۔

اس مختصر سی صحبت میں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں فلسفہ کے میدان میں مسلمانوں کی تمام کوششوں کا تفصیلی تذکرہ کر سکوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے مقصود پیش نظر کے لئے اتنا ہی کافی ہو گا کہ میں اپنی گفتگو کا خاتمہ ایک ایسی شہادت پر کر دوں جو یورپ میں نہایت وقیع سمجھی جاتی ہے۔ یہ شہادت ہے رابرٹ برفو کی جس کی کتاب ''تشکیل انسانیت'' مغربی مفکرین میں نہایت بلند مقام رکھتی ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:

> یورپ کی نشاۃ ثانیہ، پندرہویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ یہ درحقیقت رہینِ منت ہے عربی اور اندلسی اثرات کی۔ یورپ کی بعثت ثانیہ کا گہوارہ، اٹلی نہیں، ہسپانیہ ہے۔ جس وقت یورپ کی تہذیب، گرتے گرتے، وحشت و بربریت کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی، اس وقت تہذیب و تمدن کی تابناک شمعیں، بغداد، قرطبہ اور قاہرہ کی گلیوں میں روشن تھیں اور یہ شہر آنے والی تہذیب اور ثقافت کے مرکز بن رہے تھے۔ دنیا کی نئی زندگی نے انہی شہروں میں آنکھ کھولی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی موجودہ تہذیب کا کہیں وجود نہ ہوتا۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ چکی ہو گی کہ اسلام کا ابتدائی دور، خالص عمل کا دور تھا۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب عمل کے ساتھ فکر کا امتزاج ہوا۔ ازاں بعد تیسرا دور جس میں عمل ختم ہو گیا اور صرف فکر باقی رہ گئی اور اس کے بعد وہ دور جس میں نہ عمل رہا نہ فکر، قوم کے قوائے عملیہ معطل ہو گئے اور قوائے فکریہ مفلوج۔ ساری کی ساری قوم پر مدہوشی چھا گئی۔ لیکن اس کے بعد پستی کی ان مہیب تاریکیوں میں شعاعِ امید نمودار ہوئی جو دنیا میں فکرِ اقبالؔ کے نام سے متعارف ہوئی کہ جس کی عظمت کے سامنے اہلِ یورپ نے اپنا سر جھکا دیا۔ اقبالؔ نے ہمیں پھر فکر اور عمل کے اس امتزاج سے روشناس کرایا جو قرآن کی خصوصیت تھی۔ اس سے اب ایک نئی دنیا وجود میں آ رہی ہے، جس میں انسانیت، قرآن کی روشنی میں نصب العین کی طرف بڑھتی چلی جائے گی۔

وذالک الفوز العظیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر ثاقب علی

روشن خیال میانہ روی سرسید' اقبال اور جناح کا ورثہ

کم وبیش ساری اسلامی دنیا کو نو آبادی تسلط کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ ساری اسلامی دنیا نے اس تسلط کے خاتمے کے لئے دو طرح کے ردعمل ظاہر کئے ایک ردعمل پر تشدد مزاحمت کا تھا اور دوسرا ردعمل تشدد کے بغیر سیاسی تنظیم اور پر امن مزاحمت کا تھا۔ اس صورتحال کو مندرجہ ذیل گوشوارے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ (۱) افغانستان' برطانیہ اور سویت یونین کے خلاف مسلح مزاحمت (۲) الجزائر' فرانس کے خلاف مسلح مزاحمت (۳) مصر' برطانیہ کے خلاف سیاسی مزاحمت (۴) سوڈان' مہدی سوڈانی کی برطانیہ کے خلاف مسلح مزاحمت (۵) اریٹیریا' ایتھوپیا کے تسلط کے خلاف مسلح مزاحمت (۶) انڈونیشیا' ڈچ تسلط کے خلاف مسلح مزاحمت (۷) ایران' کبھی براہ راست نو آبادیاتی تسلط نہیں رہا' (۸) عراق نے برطانوی تسلط سے مسلح مزاحمت کے بغیر آزادی حاصل کی اب امریکا برطانیہ کے تسلط کے خلاف لڑ رہا ہے (۹) فلسطین' اسرائیلی تسلط کے خلاف مسلح مزاحمت جاری ہے برطانوی تسلط کے دوران یہودی آبادکاروں کے خلاف مسلح مزاحمت (۱۰) لیبیا' اطالوی تسلط کے خلاف مسلح مزاحمت (۱۱) ملائیشیا' ملائیشیا کے کمیونسٹوں نے برطانیہ کے خلاف مسلح مزاحمت کی اور شکست کھائی (۱۲) مراکش' فرانس اور سپین کے تسلط کے خلاف مسلح مزاحمت کی (۱۳) پاکستان' برطانوی تسلط کے خلاف علمی اور سیاسی جدوجہد' مسلح مزاحمت کی تحریکیں ناکام ہوئیں (۱۴) سعودی عرب' تُرک اقتدار کے خلاف مسلح جدوجہد۔

یہاں بہت ہی معروف اسلامی ملکوں کی مثال دی گئی ہے اسلامی ملکوں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو یورپی نو آبادیاتی طاقتوں کے زیر حفاظت قرار پائیں انہیں (Protectorate) کہا جاتا تھا ان میں سے اکثر نے کوئی مزاحمت ہی نہیں کی تاہم بعض نے جن میں الجزائر بہت نمایاں ہے مسلح جدوجہد کی اور پاکستان ایسے ملکوں کی آزادی کے لئے مسلمانوں نے ایک طرف مسلح جدوجہد کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئی اور دوسری طرف سیاسی جدوجہد کی جس سے آزادی حاصل ہوئی۔ مزاحمت کرنے والے اور مزاحمت نہ کرنے والے مسلمان ملکوں کے معاملات پر الگ الگ غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یا تو ایسے ممالک تھے کہ جہاں معاشرہ نہ تو تعلیم یافتہ تھا اور نہ ہی ان کی اشرافیہ میں جدید سیاسی تنظیم سازی کی صلاحیت موجود تھی۔ جہاں مسلح مزاحمت کی گئی وہاں یا تو دینی قیادت غیر ملکی اور غیر اسلامی تسلط کے خلاف جہاد کے جائز تصور کو بروئے کار لا رہی تھی یا جدید تعلیم یافتہ قیادت مغرب اور سرمایہ داری سے نفرت کے نظریات رکھتی تھی اور مسلح انقلابی جدوجہد پر یقین رکھتی تھی۔ پاکستان کا کیس اسلامی ملکوں اور اقوام کی تحریک آزادی میں یوں منفرد ہے کہ آزادی کی اس تحریک نے ایک عظیم تاریخی شعور سے جنم لیا ایک علمی اور ثقافتی تحریک کی شکل اختیار کی اور

پھر یہ سیاسی تحریک آزادی میں بدل گئی جس کی بنیاد آئین پسندی Constitutionalism پر رکھی گئی تھی اگر پاکستان نے ایک خاص تاریخی شعور کے تحت ایک علمی تحریک کے بطن سے جنم نہ لیا ہوتا تو آج پاکستان دنیا کی واحد اسلامی ایٹمی طاقت نہ ہوتا۔ 1857ء میں مسلح تحریک آزادی ناکام ہو چکی تھی۔ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی آزادی کے ساتھ اپنے عظیم لگاؤ کے باوجود یہ موقف اختیار کیا کہ مسلمانوں کی غلامی کی بنیادی وجہ ان کی جدید علوم بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی میں پسماندگی ہے۔ انہوں نے کہا کہ برطانوی غلبہ صرف ایک ملک کا ایک ملک یا ایک قوم پر غلبہ نہیں ہے بلکہ علم اور ٹیکنالوجی سے مسلح ایک تہذیب کا دوسری ایسی تہذیب پر غلبہ ہے جس نے اپنے علم و عرفان اور غور و فکر اور تحقیق کے ورثے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم آزادی حاصل کریں گے لیکن اگر ہم نے صرف مزاحمت اور تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کی اور علم کی دولت سے مالا مال نہ ہوئے تو برتر علمی صلاحیتیں رکھنے والے ملکوں کے دست نگر رہیں گے۔ چنانچہ سرسید احمد نے (۱) غیر ملکی غلبے کو مسترد کر دیا (۲) لیکن اس غلبے کی بنیادی وجوہ پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنی توانائیاں مسلح تصادم میں کھپانے کے بجائے جدید علم اور ٹیکنالوجی کے حصول میں صرف کرنی چاہئیں۔ جہاد کے ذریعے آزادی ممکن تھی لیکن حقیقی آزادی حصول علم کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ علم کے ذریعے آزادی ہر طرح کے غلبے سے نجات فراہم کر سکتی تھی۔ دیوبند کے علماء کی تحریک اور اس کے ساتھ ساتھ مخلص اور بہت محبت کرنے والے علمائے امت کی طرف سے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف اٹھائی گئی مسلح تحریکیں اپنے ان مقاصد میں کامیاب نہ ہوئیں۔ اپنی ناکامیوں کی بنا پر ان تحریکوں نے انگریز اور مغرب سے متعلق ہر شے کو مسترد کیا۔ انہوں نے انگریزی کی تعلیم اور مغربی ٹیکنالوجی حتیٰ کہ لاؤڈ اسپیکر تک کو مسترد کر دیا۔ اس کے برعکس سرسید احمد خان نے قومی مفادات کے لئے کامل اتفاق رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ حصولِ علم بنیادی مسئلہ ہے۔ مسلمان علم اور ٹیکنالوجی میں مغرب کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئے تو کوئی ان پر غلبہ برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ سرسید احمد خان نے آزادی کے بنیادی نصب العین کے ساتھ اتفاق رائے کا اظہار کرتے ہوئے علم و تحقیق، تنظیم اور غیر مسلح و پرامن جدوجہد کا راستہ چنا۔ اسے ہم روشن خیال میانہ روی کا راستہ قرار دے سکتے ہیں۔ مصور پاکستان ڈاکٹر محمد اقبال اور بانی پاکستان محمد علی جناح اسی تحریک کے نامور سپاہی تھے۔ آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سرسید مسئلہ کی بنیادی وجوہ پر غور کرنے اور زوال کے اصل محرکات کو ختم کرنے کے قائل تھے۔ اقبال فکر کی اس تحریک کا نقطہ عروج تھے۔ اقبال نے صرف علم ہی نہیں بلکہ خودی کو بیدار کرنے اور ایسی جدوجہد کو زندگی کا عنوان بنانے کی تعلیم دی جس میں مسلمان کی ایک سانس بھی ضائع نہ ہوتی ہو۔ اقبال اور سرسید کے فکری تعلق کو انکی نظم ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' میں ایک تڑپ اور سوز کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مُسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی

جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

اقبال جہاد کو زندگی کی ایک ایک سانس کا عنوان بنا کر اسے ساری زندگی پر غالب کر دینے کے قائل تھے۔ اس میں مسلح ایکشن زندگی کا ایک حصہ تھا' ساری زندگی نہیں تھی۔ اس میں علم و عرفان اور کاوش و تحقیق بہت نمایاں اہمیت کے حامل تھے۔ بانی پاکستان محمد علی جناح جدوجہد آزادی کو حتی المقدور پر امن رکھنے کے اس قدر قائل تھے کہ انہوں نے گاندھی جی کی غیر قانونی جلوسوں اور بائیکاٹ کی حکمت عملی سے بھی فاصلہ رکھا۔ انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو ایک سیاسی عالم کے شایان شان تھا اور جسے دنیا آج آئین پسندی Constitutionalism کے عنوان سے یاد کرتی ہے۔ پاکستان سرسید' اقبال اور جناح (علیہم الرحمۃ) کی روشن خیال میانہ روی کی پیداوار ہے اور اس کی جڑیں حصول علم اور عظیم غور و فکر کے کلچر میں ہیں۔ اس کی جڑیں جدید علم سے گریز کرنے والی تحریک دیوبند اور تشدد کو پہلا آپشن قرار دینے والوں کی فکر میں نہیں ہیں۔ اپنے اس عظیم علمی ورثے کی وجہ سے ہی پاکستان سائنس دانوں کی وہ کھیپ آسانی سے فراہم کر سکا جنہوں نے اسے اسلامی دنیا کی پہلی ایٹمی طاقت بنا دیا۔ ہمارا تاریخی تجربہ یہ ہے کہ روشن خیال میانہ روی نے ہمیں ملک دیا۔ آزادی اور ایٹمی طاقت دی اور جدید ریاست بنایا۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے تاریخی تجربے کی نفی کر کے روشن خیال میانہ روی کو ترک کر کے وہ راستہ اختیار کر لیں۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور' 11 جون 2004ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

قرآنی حقوقِ انسانی

جس دن سے شعور انسانی نے آنکھ کھولی ہے انسان اپنے لئے بہترین ضابطہ حیات بنانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اس کوشش و جدوجہد کا سلسلہ دراز نوعِ انسانی کی پوری تاریخ پر محیط ہے۔ اس دنیا میں سینکڑوں اقوام آئیں اور چلی گئیں، سینکڑوں نظام نمودار ہوئے اور ختم ہو گئے۔ متعدد تہاذیب کے چراغ جلے اور بجھ گئے، عقل انسانی برابر ترقی کرتی رہی۔ علوم عقلی کو فروغ حاصل ہوتا چلا گیا لیکن یہ مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا۔ ہمارے اپنے دور میں جمہوریت اور کمیونزم دونوں نظام جاری رہے، لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے کمیونزم کا نظام منقرض ہو گیا اور جمہوریت جس کا نظام آج بھی جاری ہے اس کے لئے بھی خود مفکرین و مدبرین یورپ کا اعتراف ہے کہ یہ مسائل حیات کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

انسانی نظام حیات میں جو بنیادی چیز قابل غور اور مختلف فیہ رہی ہے وہ فرد اور معاشرہ کے باہمی حقوق کا تعین تھا۔ ابتدائی دور قبائلیت اور دور ملوکیت میں فرد کا کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ ہی کسی قسم کے کوئی حقوق اس کو حاصل تھے۔ بادشاہ ہی قانون کا واحد منبع و مصدر شمار ہوتا تھا کہ جو بھی قانون اس کی ذات یا مملکت کو فائدہ دیتا تھا وہ اسے جاری کر دیتا تھا۔ انسان کے حقوق یا اس کی ضروریات کا کوئی خیال کبھی پیش نگاہ نہیں رہا۔ اور نہ ہی عوام میں اپنے حقوق کا کوئی تصور تھا۔ ہمارے ہاں مسلمانوں میں یہ تاریک ترین دور تھا۔ عوام تو ایک طرف اس زمانہ کے مفکرین بھی بادشاہ کی مطلق العنانی اور عوام کو اس کی اطاعت کی تعلیم دیتے تھے۔ سعدی شیرازی کا مشہور شعر ہے:

اگر شاہ روز را گوید شب است ایں

بباید گفت اینک ماہ و پروین

(ترجمہ) اگر بادشاہ دن کے لئے کہدے کہ یہ رات ہے تو یہ ہی کہنا چاہئے کہ ہاں یہ رہے ماہ و پریں۔

ضمناً مسلمانوں کی مزید بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ یہی تاریک ترین دور وہ دور تھا جب مسلمانوں میں مزعومہ اسلامی علوم کی تدوین ہوئی۔ اس دور کے خلافِ عقل نظریات، نیز بادشاہوں کی مطلق العنانی اور اس کا منطقی نتیجہ تقدیر کا عقیدہ، ان سارے علوم میں سرایت کر گئے جس کے نتیجہ میں جو قوم سراپا عمل اور ساری انسانیت کے لئے نگراں مقرر ہوئی تھی وہ ساری اقوام میں پست ترین ہوئی۔ بالآخر حقوق انسانی کا تصور بھی مغرب سے شروع ہوا جس کی نہایت مختصر تاریخ پیش کی جاتی ہے جس سے مقصود قارئین کرام کو یہ اندازہ کرانا ہے کہ یہ حقوق اس

دور کے بادشاہوں نے بخوشی نہیں دیئے بلکہ مجبوراً دباؤ میں آ کر (Under Pressure) دیئے ہیں۔ جس قدر دباؤ ان پر بڑھتا رہا اسی قدر حقوق وہ دیتے رہے۔ انسانی حقوق کا جاری کرنا ان کی اپنی خواہش نہیں تھی اور یہی حالت اب بھی ہے جہاں ملوکیت مضبوط ہے وہ حقوق کم دیتی ہے۔ جہاں عوام کا زور زیادہ ہے وہاں حقوق زیادہ دیئے گئے ہیں۔

ولیم (William the Conqueror) نے 1066 عیسوی میں Hastings کے مقام پر جنگ لڑی اور انگلستان کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہاں مقامی حکومتیں قائم رہیں اور (Feudal System) جاگیردارانہ نظام جاری رہا۔ یہاں تک کہ John the Lacland کا زمانہ آ گیا۔ اس بادشاہ کے زیر قبضہ بہت سا علاقہ فرانس میں بھی تھا۔ جس کی وجہ سے یہ برابر فرانس سے لڑتا رہا۔ ایک اہم مقام اس کے ہاتھ سے جاتا رہا جس کا نام Cailwy تھا۔ اس وجہ سے اس کو John the Lackland کہنے لگے۔ فرانس سے مسلسل لڑائی کی وجہ سے یہ بادشاہ اپنے Barons سے برابر رقوم اور سپاہیوں کا مطالبہ کرتا رہا اور Barns اس کو یہ دونوں چیزیں مہیا کرتے رہے۔ لیکن اس کو لڑائی میں برابر شکست ہوتی رہی۔ اس سے اس کے Barns دل برداشتہ ہو گئے اور بادشاہ اور Barons کے تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے اور بادشاہ بھی برابر پارلیمنٹ کو نظر انداز کرتا رہا۔ آخر ایک مرتبہ جب کہ بادشاہ سیر کے لئے Riennymede گیا ہوا تھا اور اس کے امراء (Barns) اس کے ساتھ تھے انہوں نے بادشاہ کو مجبور کر کے Magna Carta پر دستخط کرائے۔ یہ Magna Carta 15 جون 1215ء کو ضبط تحریر میں آیا تھا۔ اس Magna Carta کے تحریر کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت کا پوپ بھی بادشاہ کے خلاف تھا اور اس نے بادشاہ کو Ex-Communicate (ایمان سے خارج) کر دیا تھا جس کے معنے یہ تھے کہ بادشاہ اور ملک کی پوری رعایا بخشش سے محروم ہو گئی تھی۔ اس معاہدہ کی 63 شقیں تھیں لیکن اس معاہدہ کا لب لباب یہ تھا۔

(1) بادشاہ کسی کو پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر ملک بدر نہیں کر سکتا۔

(2) بادشاہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی Tax نہیں لگا سکتا۔

(3) بادشاہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کسی کو قید نہیں کر سکتا۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں شقیں barons کے متعلق ہی تھیں۔ عوام کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس کے بعد رعایا اور بادشاہوں کے تعلقات اچھے رہے یہاں تک کہ ٹوڈرز (Tudors) آ گئے۔ یہ پہلا خاندان تھا جس نے جم کے حکومت کی۔ اور اس خاندان میں بھی الزبیتھ (Elizabeth) بہت کامیاب رہی۔ وہ بہت زیرک تھی اور اس نے متاہل زندگی اختیار نہیں کی بلکہ اپنی شادی کے مسئلے کو سیاسی بنا کر اس کو Exploit کیا۔ یہ اکبر اعظم کی ہمعصر تھی۔ چونکہ اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی اس لئے اس نے اپنے قریب ترین عزیز William کو اپنا جانشین بنایا۔ یہ بادشاہ بہت Pedantic تھا اور اس کے دور میں بائبل کا Authorised Version

طبع ہوا۔ اس کے زمانہ تک بادشاہ مطلق العنان ہی ہوتے تھے اور عوام کا کوئی دباؤ حکومت پر نہیں ہوتا تھا اور بادشاہ بھی عموماً رعایا کا خیال رکھتے تھے' صرف Barons کا بادشاہ پر اثر ہوتا تھا۔ ولیم کے بعد اس کا بیٹا چارلس اول حکمران ہوا اور اس کے دور کے شروع سے ہی لڑائی اور تنازعات شروع ہو گئے۔ اس کے دور میں تین پارٹیاں تھیں اور تینوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں تھا۔ چنانچہ اس بادشاہ کے دور میں Bill of Rights اور Petition of Rights پاس ہوئے۔ لیکن بادشاہ برابر وعدہ خلافی کرتا رہا یہاں تک کہ اس کو پھانسی دے دی گئی۔ یہ Bill of Rights اور Petition of rights انسانی حقوق کے تسلیم شدہ Documents تھے اور اس طرح حقوق انسانی تحریری شکل میں آئے۔ یہ دور سترھویں صدی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد 1789 میں فرانس کا انقلاب برپا ہوا اور Decleration of Rights عالم وجود میں آیا۔

اصل بات جو بہت ہی اہم اور انقلابی ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا نظریہ انسانی حقوق کے سلسلہ میں موجودہ مغربی حقوق کے نظریہ سے بالکل منفرد ہے۔ اس کے نزدیک یہ انسانی حقوق ہی نہیں ہیں' زیادہ سے زیادہ یہ قانونی حقوق (Legal Rights) ہیں۔ وہ بھی صرف وہاں جاری ہو سکتے ہیں جہاں حکومت کی اپنے عوام پر گرفت کمزور ہو' اور عوام کا حکومت پر کافی دباؤ ہو۔ لیکن قرآنِ کریم کے نزدیک ان حقوق کی بھی اہمیت ہے۔ قرآنِ کریم کا انسانی حقوق سے متعلق نظریہ معلوم کرنے سے پیشتر قرآن کے تصور زندگی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ جب تک قرآنِ کریم کا تصور حیات سامنے نہیں آتا' اس کے حقوق وفرائض کا تصور بھی واضح نہیں ہو سکتا۔

انسانی زندگی سے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ عام حیوانی بچوں کی طرح پیدا ہوتا ہے وہ طبعی قوانین کے تابع زندگی گزارتا ہے۔ افزائش نسل کرتا ہے اور ان ہی طبعی قوانین کے مطابق اپنی پوری زندگی گزار کر مر جاتا ہے اور اس طرح اس انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان متمدن واقع ہوا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی سوسائٹی میں زندگی بسر کرے اس لئے وہ کوئی نہ کوئی سوسائٹی یا معاشرہ بناتا ہے۔ سوسائٹی یا معاشرہ میں رہنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ سوسائٹی کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد وضع کرتے ہیں جو حالات ومصالح کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

یہ ایک نظریۂ زندگی تھا جو تحریر کیا گیا ہے۔ زندگی کا دوسرا نظریہ جو قرآن حکیم کا پیش کردہ ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک طبعی زندگی کا تعلق ہے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں لیکن انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں ہے۔ اس کی طبعی زندگی' حیات (The Life) کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ یہ اس کی آخری کڑی نہیں ہے۔ اسی سلسلہ کو آگے جاری رہنا ہے۔ طبعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے طبعی قوانین کافی ہیں لیکن ارتقا کی اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے طبعی قوانین کے علاوہ ایک اور ضابطۂ قوانین کی ضرورت ہے' جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہیں اور نہ ہی کسی سوسائٹی کی۔ یہ ازلی وابدی ہیں۔ مطلق (Absolute) ہیں۔ یہ اقدار انسانیت کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے عنایت فرمائی ہیں جو

انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں کو ملتی رہی۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے اعمال وحی الٰہی یعنی مستقل اقدار کے مطابق ہوئے تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے' لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا' اور اس فرد کے بیشتر اعمال مستقل اقدار کے خلاف ہوئے تو وہ زندگی کی پست سطح پر رہے گا۔ اعمال کے اثرات مرتب ہونے میں کسی پولیس' یا عدالت' یا حکومت کی کسی ایجنسی کا کوئی دخل نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے قانون مکافاتِ عمل کی رو سے خود مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور کائنات کی قوتیں جنہیں قرآنِ کریم نے ملائکہ کہا ہے وہ یہ اثرات مرتب کرتی ہیں لیکن ہم شعور کی موجودہ حالت میں یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کس طرح یہ اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ یہ دونوں نظریات زندگی' ایک دوسرے سے بالکل الگ منفرد' متخالف اور متناقض ہیں۔ ان دونوں نظریات زندگی میں باہم آمیزش نہیں ہو سکتی۔

چونکہ اس مضمون کا سارا دارومدار اسی نکتہ پر منحصر ہے' اس لئے اس کی دوبارہ وضاحت دوسرے پیرائے میں کی جاتی ہے تاکہ معزز قارئین کرام پر یہ مضمون اچھی طرح واضح ہو جائے۔ علمی دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے نظریات جاری ہیں۔ ایک تصور حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف طبعی زندگی Physical Life پر مشتمل ہے۔ ہر انسان طبعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور ان ہی طبعی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور ان ہی قوانین کی رو سے وہ فوت ہو جاتا ہے۔ جب اس کا سانس بند ہو جاتا ہے تو فوری اس شخص کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس تصور حیات کو مادی نظریۂ حیات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے بالکل برخلاف دوسرا تصور زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی کا نام نہیں ہے بلکہ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ذات' ''میں'' Self یا زندگی کہتے ہیں۔ یہ طبعی قوانین کے ماتحت نہیں ہوتی اور نہ ہی انسانی جسم کی موت سے اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اگر اس کی مناسب نشوونما کر لی جائے تو موت کے بعد بھی وہ زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما ان قوانین کے ماتحت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرامؑ کی معرفت بذریعہ وحی ملتے تھے۔ زندگی ایک مسلسل جاری رہنے والی ندی ہے جو اس دنیا کے صحراؤں سے گذر کر آخرت کے باغوں اور چمنستانوں میں داخل ہوجاتی ہے اور موت اس باڑ یا Curtain کا نام ہے جو ان دونوں کے درمیان حائل ہے جس کی وجہ سے ہم اس لق و دق صحرا میں کھڑے ہونے کی وجہ سے زندگی کی اس ندی کو اس باڑ (Curtain) سے آگے نہیں دیکھ سکتے ورنہ تو بقول احسان دانش مرحوم ؎

موت کے صدمہ سے کم ہوتی نہیں تابندگی
اس طرف بھی زندگی ہے' اس طرف بھی زندگی

زندگی سے متعلق قرآنی نظریہ کی وضاحت کے بعد ہم اب اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

یہ بات تو درست ہے کہ قرآنِ کریم کے نزدیک اصل مقصد ذات کی نشوونما اور اس کا مابعد موت کا ارتقاء ہے اور

اسے ہی وہ زندگی بھی کہتا ہے وان الدار الآخرة لھی الحیوان ((29/64 اور آخرت کا گھر جو ہے تو وہی زندگی ہے۔ تاہم اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اس دنیا کی طبعی زندگی کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ اس دنیا کی طبعی زندگی کو بھی بہت اہمیت دیتا ہے اور اس دنیا میں زندگی گذارنے کی ہدایات عنایت فرماتا ہے اس کا نظریہ ہے کہ چونکہ عقل انسانی اپنے مسائل حیات خود طے کرنے کے قابل نہیں ہے اس لئے وہ ان کا حل پیش کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے انسانیت پر فرض ہے کہ وہ اپنی حیات اجتماعیہ اس کے پیش کردہ نظام کے مطابق بنائیں۔ قرآنِ کریم جو نظام پیش کرتا ہے اس میں بھی اس نے حقوق انسانی کی نشاندہی کردی ہے۔ جن کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔ لیکن ان کی اہمیت اس تناسب سے ہے جس قدر اہمیت جسم کی ذات کے مقابلہ میں ہے۔ قرآنی تصور حیات کے مطابق ان کا نام انسانی حقوق نہیں ہوسکتا بلکہ انہیں قانونی حقوق (Legal Right) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انسانی حقوق تو صرف وہ حقوق ہیں جو انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق ہوں۔ لیکن چونکہ عام طور پر حقوق انسانی کی اصطلاح ہی ان طبعی قوانین کے بارے میں استعمال کی جاتی ہے' اس لئے پیش نظر مضمون میں بھی سہولت کے پیش نظر وہی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔ فی الحال' اس طبعی دنیا کے انسانی حقوق کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

مضمون کے بالکل ابتدائی حصہ میں انسانی حقوق کی تاریخ مجمل طور پر تحریر کردی گئی ہے جس سے قارئینِ کرام کو بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ انسانی حقوق بتدریج Develop ہوئے ہیں اور اس میں عوام اور بادشاہوں یا مقتدر اداروں کی مسلسل کشمکش رہی ہے۔ جہاں حکومت کمزور ہوتی گئی اور عوام زور پکڑتے گئے وہاں ان حقوق پر اضافہ ہوتا چلا گیا اور عوام نے کچھ حقوق حاصل کر لئے۔ لیکن قرآنِ کریم کا تصور اس بارے میں بہت بلند وارفع ہے۔ قرآنِ کریم تو حکومت کے قیام کا جواز ہی یہ دیتا ہے کہ وہ حکومت اس لئے قائم ہوتی ہے کہ اس میں انسانی حقوق جاری کئے جائیں۔ ارشاد حضرت باری عزاسمہ ہوتا ہے' الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ اتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور ((22:41 وہ یہ کہ اگر ہم ان کو اقتدار دیں تو یہ نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں' معروف کا حکم دیں' منکر سے منع کریں اور ہر کام کا آخر اللہ کے اختیار میں ہے۔ معروف اور منکر قرآنِ کریم کی جامع اصطلاحات ہیں۔ معروف کے معنے ہی اسلامی حکومت کے احکامات اور انسانی حقوق ہیں۔ اسی طرح مناھی وہ امور ہیں جن سے اسلامی حکومت وقتاً فوقتاً منع کرتی رہتی ہے۔ یہ معروف ومنکر حالات' خطے ازمنہ کے مطابق بدلتے رہتے ہیں اور اسلامی حکومت ان کا اجراء کرتی رہتی ہے اور اسی بات کی نگرانی کرتی رہتی ہے کہ تمام حقوقِ انسانی جاری ہو رہے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے جو حکومت انسانی حقوق جاری نہیں کرتی اسے حکومت کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔

حقوقِ انسانی کے سلسلہ میں عقلِ انسانی نے جہاں تک ترقی کی وہ قابلِ ستائش ہے۔ لیکن ان حقوق سے انسانیت کو مکمل فلاح واطمینان حاصل نہیں ہوسکا۔ قرآنِ کریم موجودہ

دور تک حاصل کردہ حقوق میں سے اکثر کو جائز قرار دیتا ہے بلکہ اس کا امران کے اجراء پر ہے لیکن وہ حقوق جن کی وہ نشاندہی کرتا ہے عقلِ انسانی ان تک ابھی نہیں پہنچی اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ عقلِ انسانی کی گرفت سے باہر ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ مختلف اقوام کا تصادم ان کو جاری نہیں کرنے دیتا۔ قرآنِ کریم کے منفرد حقوقِ انسانی درج ذیل ہیں۔

(1) بدلہ صرف محنت کا ہے' لیس للانسان الا ماسعیٰ۔

(2) ساری انسانیت ایک ہے۔ ممالک' اوطان کی تقسیم انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔

(3) احسان۔

(4) انفاق فی سبیل اللہ۔

(5) ملکیت زمین بالکل حرام ہے۔ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اور ہر شخص اس سے برابر کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(6) حق کو چھپانا اور اس میں التباس کرنا سخت جرم ہے۔

(7) وسائل رزق سب انسانوں کے لئے کھلے ہیں اور سب کا ان پر حق ہے۔

(8) ایفائے عہد۔

(9) مدارج بہ اعتبارِ عمل۔

(10) نیکی میں تعاون۔

(11) دشمن سے نیک سلوک کرنا۔

(12) نسل پرستی' وطن پرستی' انسانیت کو تقسیم کرتی ہے۔

اور اسی طرح متعدد حقوق جو منفرد ہیں اور جن کا شمار کرنا بیک وقت مشکل ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا تحریر کردہ حقوقِ انسانیت وہ ہیں جن کے متعلق رسالہ طلوع اسلام اور ادارہ طلوع اسلام کی شائع کردہ کتب میں اس قدر مواد فراہم کیا گیا ہے کہ اسے دوبارہ تحریر کرنا' قارئینِ کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ وہ ان حقوقِ انسانی کے متعلق کسی بھی وقت ادارہ طلوع اسلام کے فراہم کردہ لٹریچر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ وہ حقوق ہیں جو قرآنِ کریم کے منفرد عطا کردہ ہیں۔ ابھی انسانیت اس معیار پر نہیں آئی کہ ان کو اب تک کے تسلیم کردہ حقوقِ انسانیت کی فہرست میں شامل کرے۔ لیکن یہ قرآنِ کریم کے داعینِ کا فرض ہے کہ وہ ساری دنیا کو قرآنِ کریم کے عطا کردہ ان حقوق سے متعارف کرائیں۔ جس دن انسانیت نے یہ حقوق بہ رضا و رغبت تسلیم کر لئے' اس دن بنی نوع انسان کی بیشتر مشکلات خود بخود دور ہو جائیں گی۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اقدار (Values) کو نہایت خلوص اور حکمت کے ساتھ دنیا میں متعارف کرایا جائے۔ آج ساری دنیا کی حالت یہ ہے کہ ہر جگہ ایک اضطراب ہے جس کی وجہ سے کسی خطۂ زمین میں سکون و اطمینان نہیں ہے۔ جو ممالک نہایت مہذب و متمدن شمار ہوتے ہیں' ان کی تہذیب و تمدن بھی اندر سے بالکل کھوکھلی ہے اور ہر آدمی دوسرے آدمی سے خوفزدہ بھی ہے اور ہر شخص دوسرے کو Exploit بھی کر رہا ہے۔ ان ہی معاشروں میں انسانیت کا درد رکھنے والے مسلمان ان حقوق کی اشاعت کریں تو ملاحظہ کریں کہ کس طرح ان کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

اب اصل موضوع قرآنی انسانی حقوق کی طرف

رجوع کرتے ہیں۔ ان حقوق سے دلچسپی صرف ان حضرات کو ہوسکتی ہے جو انسانی ذات' مکافاتِ عمل' آخرت اور آخرت میں زندگی اور ذات کے ارتقاء پر یقین رکھتے ہوں' کیونکہ اصل میں انسانی حقوق وہی ہیں جو انسانی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔

حقوقِ انسانی کا متعین کرنا عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ حقوق وحی کے ذریعے عطا ہوئے ہیں۔ جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات' ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔ یہ مستقل اقدار کہلاتی ہیں اور ان ہی کا نام انسانی حقوق ہے۔ ان مستقل اقدار یا انسانی حقوق پر عمل کرنے سے انسانی ذات کی تربیت و پرورش ہوتی ہے۔ اگر ان انسانی حقوق کو کسی بھی معاشرے میں جاری کر دیا جائے تو یہ وہ معاشرہ ہے جس کو قرآنِ کریم نے جنت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حضور ﷺ کے مخالفین آپ سے کہتے تھے کہ اگر آپ واقعاً اللہ کے رسول ہیں تو تکون لک جنۃ من نخیل و عنب فتفجر الانہٰر خللھا تفجیرا ((17:91' تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک ایسا باغ (جنت) ہونا چاہئے جس میں پانی کی ندیاں بہہ رہی ہوں۔ اس کے جواب میں فوری طور پر قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا کہ یہ ایک جنت (باغ) کہتے ہیں خدا تمہیں جنتیں (باغات) عطا کرے گا اور ان کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ جعل لک خیرا من ذلک تجری من تحتھا الانہٰر ویجعل لک قصورا ((25:10' جنت کے علاوہ تمہارے لئے محلات بھی ہوں گے۔ یہ وہ جنت ہے جو مستقل اقدار یا حقوق انسانی پر عمل کرنے کے نتیجے میں اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے' اور جو حضور ﷺ اور آپ کے رفقاء کو اس دنیا میں حاصل ہوئی۔

انسانی حقوق میں سرفہرست جو حق آتا ہے اور جسے آج سے چودہ سو سال پیشتر قرآنِ کریم نے عطا فرمایا وہ ایک ایسا انقلابی نعرہ ہے کہ جس کی جس قدر تعریف و تحسین کی جائے وہ کم ہے اور انسانیت اپنے بلوغ کے باوجود آج تک اس نعرہ تک نہیں پہنچ سکی۔ جو سب سے بنیادی اور اول حق پوری انسانیت کا ہے وہ یہ ہے کہ انسان پر انسان کی حکومت حرام ہے اور باعثِ تذلیلِ انسانیت ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حقِ حکومت صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے مختص ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے ان الحکم الا للہ ((12:40' حقِ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ لا یشرک فی حکمہٖ احداً ((18:26' اللہ تعالیٰ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اگر کسی انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کو حق حکومت دے دیا جائے' خواہ اس کو کسی نام سے بھی موسوم کریں تو یہ کھلا ہوا شرک ہوگا اور کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ قرآنِ کریم نے الہ کا لفظ حاکم' صاحب اقتدار کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ لئن اتخذت الھاً غیری لا جعلنک من المسجونین ((26:29' اگر تو نے میرے سوا کسی کو بھی حاکم تسلیم کیا تو میں تجھے قید کر دوں گا۔ یہاں الہ کے معنے حاکم کے ہیں۔ وھو الذی فی السماء الہ و فی الارض الہ ((43:84' وہی ہے جو کائنات کی بلندیوں میں بھی حاکم ہے اور پستیوں میں بھی۔ ہم

مسلمان ہر روز پانچ وقت اذان میں یہی نعرہ بلند کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی حاکم نہیں ہے۔ اسلامی مملکت میں تمام کاروبار خدا کی کتاب کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ چونکہ انسانی ذات کی بنیادی صفات وہی ہیں جو صفات خداوندی ہیں اس فرق کے ساتھ کہ انسانی ذات کی یہ صفات محدود شکل میں ہوتی ہیں نیز قابل نشوونما۔ ان کی نشوونما اس طرح ہوتی ہے کہ انسان صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار قرار دے۔ یہ انسان اور خدا کا بنیادی تعلق ہے جس چیز کو اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت کہا جاتا ہے وہ ان ہدایات کا اتباع ہوتا ہے جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت چونکہ مستقل اقدار نافذ کرتی ہے وہی انسانی حقوق ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر متفرع ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلامی حکومت کی اطاعت سے انسانی ذات میں ازخود صفات خداوندی کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس سے انسانی ذات کی نشوونما ہونے کے ساتھ ساتھ اس ذات کے تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ جس طرح پانی پینے سے کسی غیر کی اطاعت مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کا مقصد پیاس بجھا کر اپنی ہی تسکین کرنا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں Rights اور Duties، حقوق وفرائض ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جو ایک شخص کا فرض ہوتا ہے وہ دوسرے کا حق بنتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآنِ کریم کی رو سے ہر ماں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو دو سال تک دودھ پلائے۔ مولین کاملین ((2:233، اس لئے ہر بچہ کا حق ہے کہ وہ اپنی ماں سے دو سال تک دودھ پیئے۔ اسی طرح قرآنِ کریم میں آتا ہے۔

یاایھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا ((24:27، اے ایمان والو بغیر اجازت حاصل کئے دوسرے کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو چنانچہ یہ پڑوس پر فرض ہے کہ دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت داخل نہ ہوں۔ اسی طرح ہر شخص کا حق ہے کہ کوئی شخص اس کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہو۔ اس طرح حقوق وفرائض ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جو ایک شخص پر فرض ہوگا وہی دوسرے کا حق ہوگا۔ اس تمیز کے بعد عرض ہے کہ قرآنِ کریم نے عہد و پیمان کی پابندی کرنا ضروری قرار دیا ہے' یاایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود ((5:1، تم اپنے عہد و پیمان پورے کیا کرو تم سے عہد و پیمان کے لئے پوچھا جائے گا۔ عہد کا پورا کرنا فرض ہے تو اسی طرح دوسروں کا حق ہے کہ کوئی آدمی ان سے بدعہدی نہ کرے، بدعہدی کرنے سے انسانی ذات پر برا اثر مرتب ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے جسم کو طبعی قوانین (Govern) کرتے ہیں لیکن ذات، نفس یا زندگی کو وحی کی مستقل اقدار (Govern) کرتی ہیں اور جب ذاتی مفاد یا مستقل قدر میں Tie (مقابلہ) پڑتی ہے تو اس وقت ذات کی ترقی واضمحلال کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اپنا ذاتی مفاد ترک کر دیا اور مستقل قدر پر عمل کیا تو آپ کی نفس میں ترقی ونشوونما ہوگی۔ لیکن اگر آپ نے اس کے برعکس اپنے مفاد کو ترجیح دی تو آپ کے نفس کو اضمحلال ہوگا۔ فرض کیجئے آپ کو اپنے لئے مکان خرید کرنا ہے، لیکن آپ کے پاس اتنی رقم نہیں ہے مگر آپ حرام کی کمائی حاصل کر کے مکان خرید سکتے ہیں۔

یہاں آپ کے ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں Tie آ پڑتی ہے۔ اگر آپ نے مستقل قدر کو اختیار کیا اور حرام کی کمائی سے اجتناب کیا اور آپ مکان نہیں خرید سکے' تو اس سے آپ کی نفس میں پختگی پیدا ہوگی اگر آپ نے حرام کی کمائی قبول کر لی اور مستقل قدر کی پراوہ کئے بغیر مکان خرید لیا تو آپ کے نفس' ذات میں اضمحلال واقع ہوگا۔

عہد و پیمان کا پورا کرنا مستقل قدر ہے۔ اس سے ذات میں برومندی ہوتی ہے اور یہ ہر انسان کا حق ہے کہ دوسرا آدمی اس سے عہد پورا کرے انفرادی بھی اور قومی سطح پر بھی۔ آج ساری دنیا میں خصوصاً سیاسی معاہدات میں جو عہد شکنی ہوتی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ معاہدہ تحریر کرنے سے پیشتر ہی Loopholes' چور دروازے رکھوائے جاتے ہیں جن سے عہد شکنی ہو سکے۔ سیاسی زبان میں جس زبان کو Diplomatic Languge کہتے ہیں وہ یہی انگریزی زبان ہوتی ہے جسے ہم رات دن استعمال کرتے ہیں Diplomatic Languge کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن سے ہر دوسرے فقرے میں دو دو تین تین مفاہیم نکالے جا سکیں اور پہلے سے ہی ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ اس معاہدے سے انکار کیا جا سکے اور جو شخص جس قدر اس زبان کا ماہر ہوگا اس کی اسی قدر عزت ہوگی اور ہر اہم دستاویز اس سے ہی تحریر کرائی جاتی ہے۔ اس زبان کی بہت اہمیت ہے ورصرف اس وجہ سے کہ بدعہدی ہو سکے۔

موجودہ دور میں بدعہدی اور سیرت کی خامی کو واضح کرنے کے لئے ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ 1962ء میں جب چین اور ہندوستان کے مابین لڑائی ہو رہی تھی تو پنڈت نہرو نے پیشکش کی کہ جنگ کے بجائے کسی معروف بین الاقوامی شخصیت کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ دونوں ممالک کے مابین فیصلہ کرا دے اس پر مسٹر چواین لائی نے جواب میں کہا تھا کہ آج ساری دنیا میں ایک شخص ایسا نہیں جو قابل بھروسہ ہو اور دیانتداری سے بات کرے۔ سیاسی شخصیات کے لئے مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ واقعاً ساری دنیا میں سے کسی نے یہ للکار کر نہیں کہا کہ میں دیانتدار اور دوٹوک بات کرنے والا ہوں اور یہ میری سابقہ زندگی میرے دعویٰ کی شہادت ہے۔ یہ مقام صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ہی مخصوص ہے کہ وہ چاروں طرف سے مخالفین و معاندین کے نرغہ میں آنے کے باوجود علی اعلان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میری سابقہ زندگی میری پختہ سیرت کی دلیل ہے۔ فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تعلقون ((10:16' اور مخالفین کو اس بات کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ حضور ﷺ کے اس دعویٰ کی تردید کر دیں۔

انسانیت کے لئے نفع بخش ہونا

مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام انسانیت کے لئے نفع بخش ہوں اور خود مسلمانوں کا ایک دوسرے پر' اور غیر مسلموں کا تمام مسلمانوں پر یہ حق کہ انہیں مسلمانوں سے فائدہ ہی ملتا رہے۔ نفع بخش کاموں کو' گروہوں' اوطان' اقوام کے دائروں میں محدود کر دینا قرآنِ کریم کی عطا کردہ مستقل اقدارر کے خلاف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ واماما ینفع الناس فیمکث فی الارض ((13:17' زمیں میں

دوام صرف اس کو حاصل ہوگا جو تمام انسانیت کے لئے نفع بخش ہو۔ حج بیت اللہ شریف کا Institution اسلام میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا واحد مقصد قرآنِ کریم نے یہی بیان فرمایا ہے کہ حج اس لئے ہے کہ اس میں ساری انسانیت کو نفع پہنچانے کے طریقے اور اسباب سوچے جائیں اور ساری انسانیت خود وہاں آ کر اس بات کا مشاہدہ کرے کہ مسلمان ساری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کیا طریقے اختیار کر رہے ہیں' لیشھدوا منافع لھم (22:28)' قرآنِ کریم کی رو سے یہ ان کا حق Right ہے کہ وہ مسلمانوں سے منافع حاصل کریں۔

قرآنِ کریم کی رو سے عصمت کی حفاظت بھی ایک مستقل قدر ہے۔ قرآنِ کریم نے جنسی تعلق کا صرف ایک ہی طریقہ بتایا ہے اور وہ نکاح ہے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا' ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحاً حتی یغنیھم اللّٰہ من فضلہٖ (24:33)' بس چاہئے کہ عفت کی زندگی بسر کرو یہاں تک کے اللہ غنی کر دے اپنے فضل سے اور نکاح ہو جائے۔ اس سے واضح ہے کہ جس شخص کے لئے نکاح کی صورت نہ ہو سکتی ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔ عصمت کے بارے میں ایک نکتہ اور بھی قابلِ تحریر یہ ہے کہ Sex کے لئے اضطراری حالت نہیں ہے۔ بھوک' پیاس میں اضطراری کیفیت ہو جاتی ہے اور اس میں حرام مال بھی حلال ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص سخت بھوکا ہے اور مرنے سے بچنے کے لئے حرام مال یا حرام چیز یا غیر مذبوحہ کھا لے' تو اس کی کوئی گرفت نہیں ہے۔ ہاں یہ گنجائش Sex میں نہیں ہے کیونکہ قرآنِ کریم اس میں اضطراری حالت کو تسلیم نہیں کرتا۔ حفاظتِ عصمت ہر حال میں لازم ہے۔

قرآنِ کریم کی ایک قدر یہ بھی ہے کہ نوعِ انسانی امت واحدہ ہے اور تمام انسان نفسِ واحدہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اصل کے اعتبار سے تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ اسی لئے تمام نوعِ انساں کا ایک عالمگیر برادری اور ایک قوم بن کر زندگی گذارنا مقصودِ حیات ہے' کان الناس امۃ واحدۃً۔ تمام انسانیت ایک امت واحدہ ہے۔ اقوام اوطان کی تقسیم نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جس قدر نقصان پہنچایا ہے' اس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ کریم کی رو سے ہر فرد کا حق ہے کہ وہ کسی بھی ملک میں چلا جائے اور اپنے آپ کو کسی بھی قوم میں شامل کر لے' یہ ہر فرد انسانیت کا حق ہے۔

اصل مقصود اس مضمون کا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے انسانی حقوق وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق انسان کی ذات سے ہوتا ہے اور انسانی ذات سے متعلق قوانین صرف وحی کے ذریعے مل سکتے تھے۔ عقلِ انسانی کے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ وہ انسانی ذات سے متعلق حقوق بنائیں۔ فلہٰذا جو اقوام وحی یا ذات کی قائل ہی نہیں ہیں وہ انسانی حقوق کا تعین نہیں کر سکتی وہ صرف Legal Rights بنا سکتی ہیں اور بس۔

فستذکرون ما اقول لکم (40:44)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید امتیاز احمد

پھول جو میں نے چُنے

(''قتلِ مرتد' غلام اور لونڈیاں'' سے ماخوذ)

قرآن کا پیغام شرفِ انسانیت کا پیغام اور اس کی دعوت احترامِ آدمیت کی دعوت ہے۔

☆☆☆

انسان بحیثیت انسان واجب التکریم ہے۔ اس کا انسان ہونا اس کے لئے باعثِ شرف ہے اور یہ شرف وتکریم ہر فرزندِ آدم کے لئے ہے۔

☆☆☆

یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف میں سے جو کچھ کسی نے کہہ دیا ہے وہ منزل من اللہ' تنقید کی حد سے بالا ہے۔۔۔ ہمیں اپنے اسلاف کی فکر کے نتائج پر آنکھیں بند کر کے چلتے چلے جانا چاہئے۔ یہی اسلاف پرستی اس قوم کو لے ڈوبی۔

☆☆☆

کفر ہو یا ایمان' اس کا تعلق اعماقِ قلب سے ہے یہ اقرار جب تک دل کی گہرائیوں سے نہیں پھوٹتا اقرار کہلا ہی نہیں سکتا۔

☆☆☆

اگر کہنے والا اپنے دعوے کے ثبوت میں عربی کے چار فقرے پیش کر کے انہیں حدیث' صحابہؓ کے فیصلے اور ائمہ فقہاؒ کی رائے قرار دے دے تو کیا اس کے قول کو محض اس لئے دین مان لیا جائے گا کہ اس نے عربی کے ان فقروں کی نسبت حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم' صحابہ کرامؓ اور ائمہ فقہاؒ کی جانب کر دی ہے اور ایسا کرنے میں قطعاً نہیں شرمایا؟

☆☆☆

کفر وایمان کے معاملے میں جور واستبداد انسانیت کے خلاف بدترین جرم ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس باب میں انسان کو اختیار وارادہ دیا ہے۔ اب اس اختیار وارادہ کو سلب کر لینا' خدا کے فیصلے کے خلاف کھلی بغاوت اور شرف آدمیت کا سلب ونہب ہے۔

☆☆☆

جس طرح ذہنِ انسانی کے عہد طفولیت میں پیشوائیت نے دیوتاؤں کا وجود پیدا کیا تھا اور ان کے نام پہ سب کچھ روا رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح عہدِ جدید میں اسٹیٹ کے وجود کا بت تراشا گیا ہے۔ صرف الفاظ بدلے ہیں روح وہی ہے۔

☆☆☆

اسلام یقیناً اپنے نظام کا تحفظ چاہتا ہے لیکن اس کے تحفظ کی قوت کا راز افرادِ ملت کے ایمانِ محکم میں ہوتا ہے جو دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ جن لوگوں کو زبردستی ملت کے ساتھ باندھ کر رکھا جائے ان کا وجود نظام کے استحکام کی بجائے اس کی سخت کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم نے قدم قدم پہ تدبر و تفکر اور تحقیق و تدقیق کی تائید کی ہے۔ اس سے قرآنی حقائق ہر زمانے میں بے نقاب ہوتے تھے۔۔۔۔لیکن جب اربابِ مذہب نے حکم صادر کر دیا کہ جو شخص کوئی ایسی بات کہے جوان کے عقیدے کے خلاف ہو اسے مرتد قرار دے دیا جائے گا تو قرآن پہ تفکر و تدبر کا دروازہ بند ہو گیا اور امت کے ذہن پر تقلید جامد کے تالے پڑ گئے۔

☆☆☆

۔۔۔۔اسلام کی راہ کامرانیوں اور شادکامیوں کی راہ ہے اور کفر کی راہ ناکامیوں اور تباہیوں کی راہ۔ یہ اسلام پر قائم رہتے تو کامران و کامیاب زندگی بسر کرتے۔ انہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی تو ان کی کامیابیاں ناکامیوں میں بدل گئیں۔۔۔

☆☆☆

جو بات قرآن کے خلاف ہے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ صرف قرآن ہم تک محفوظ پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ اس (اللہ) نے نہیں لیا۔

☆☆☆

ملا کو اس سے کیا غرض کہ قرآن کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ اس کا دین روایات پرستی ہے۔ وہ پرستش ہی اشخاص کی کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے معبودوں کی سلامتی چاہتا ہے۔ خواہ اس میں خدا باقی رہے یا نہ رہے۔

☆☆☆

صدمہ اس کا نہیں کہ عجم کے منافقین نے روایات سازی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو کس طرح مسخ کر دیا۔ صدمہ اس کا ہے کہ آج ہمارا ملا کس طمطراق سے ان روایات کو دین بنا کر پیش کئے جا رہا ہے۔۔۔۔دنیا انہی باتوں کو مستند قرار دے کر اچھال رہی ہے اور اسلام کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

☆☆☆

اگر کوئی چیز خدا کے قانون کے خلاف ہے تو اسے خواہ ساری دنیا کی اقوام بطور قانون اختیار کر لیں ایک مسلمان کے نزدیک وہ باطل ہی رہے گی۔ حق نہیں قرار پا جائے گی۔

☆☆☆

ملوکیت نے انسانی جسم کے لئے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بنوائیں اور پیشوائیت نے انسانی ذہن کی جکڑ بندیوں کے لئے عقیدے و ارادت کے دامِ ہمرنگِ زمیں تیار کئے۔ ان دونوں کے باہمی سمجھوتے نے راجہ کو ایشور کا اوتار، بادشاہ کو ظل اللہ اور کنگ کو حقوق خداوندی کا حامل بنا دیا۔

☆☆☆

انسانی زندگی کے لئے صحیح معاشرہ وہی ہے جو وحیٔ خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ چونکہ اس معاشرے کی بنیاد ہی ایمان پر ہے اور ایمان صرف اس وقت ایمان کہلا سکتا ہے جب وہ دل کی رضامندی سے قبول کیا جائے۔ اس لئے اس معاشرے میں جبر و اکراہ کا تصور ہی ناممکن ہے۔

☆☆☆

اسلامی نظام اور قرآنی سٹیٹ میں جور و تغلب اور جبر و اکراہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ اسٹیٹ ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو اس راہ میں سر جھکانے سے پہلے دل جھکا چکے ہوتے ہیں۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نظر

غلام باری، مانچسٹر

مہلت (Respite) کا وقفہ

افراد کی طرح اقوام میں بھی خدا کا قانونِ مکافات کارفرما رہتا ہے۔ جس کی رُو سے صحیح روش پر چلنے والی قوم کو عروج اور ترقی حاصل ہوتی ہے۔ غلط روش پر گامزن زوال و ہلاکت کے گڑھوں میں گر جاتی ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ تو اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس طور پر اسی وقت سامنے نہیں آجاتا۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے کے وقفہ کو مہلت کی مدت کہا جاتا ہے۔ اگر اس دوران میں فرد یا قوم غلط روش چھوڑ کر قوانینِ خداوندی کا اتباع شروع کر دے تو اس کے سابقہ غلط اعمال کے تخریبی نتائج مٹ جاتے ہیں اور انہیں سامان حفاظت مل جاتا ہے۔ اسے توبہ یا مغفرت کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے غلط روش پر چلنے والی قوم کی گرفت فوری نہیں ہو جاتی خدا مہلت دیتا ہے اور مہلت کا مل جانا خدا کا فضل ہے تاکہ یہ اس میں اپنی اصلاح کر لے۔ قرآن میں غور و فکر سے عجب بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ہم پاکستانیوں کی مماثلت قوم بنی اسرائیل سے پائی جاتی ہے۔ وہ مصر سے ہجرت کر کے سینا کی وادی میں آئے تھے ہم بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں گوسالہ پرستی کا شرک کیا ہم بھی قائداعظمؒ کی وفات کے بعد پارٹی بازی کے عذاب اور فرقہ بندی کے ناقابل معافی شرک میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے تورات میں تحریف کر کے اسے پسِ پشت ڈالا، ہم نے بھی اپنے معتقدات اور رسومات کی رسیوں سے قرآن کو جکڑ کر مہجور بنا رکھا ہے۔ یہودی علماء نے خود وضع کردہ عقیدہ ''وحی غیر متلو'' کی رو سے روایات جمع کر کے اسے تورات کا درجہ دے دیا۔ ہمارے علماء مشائخ نے ''وحی خفی'' کے عقیدہ سے جھوٹی سچی روایات کو قرآنِ کریم پر قاضی ٹھہرا دیا۔ انہوں نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ ہم نے بھی اپنے بداعمال اور مصنوعی نسبت سے نبی کریمؐ کے مقدس نام اور اسلام کو ساری دنیا میں بدنام کیا ہوا ہے۔ یہود کو اپنی غلط روش کی وجہ سے 1878 سال ذلت آمیز زندگی بسر کرنے کے بعد غیروں کی پشت پناہی سے دوبارہ اپنا ملک ملا۔ سورۃ الحج میں مذکور ہلاکت انگیز تباہی و بربادی میں گرفتار اقوام کی طرح ہمارے دریاؤں کا پانی بھی ناکافی ہوتا جا رہا ہے، اوپر سے بارش بھی کم ہی ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ نیچے کنویں بھی بےکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ معاشرہ میں روز بروز ناہمواریاں اور برائیاں بھی ترقی کرتی جا رہی ہیں۔ ہمارا ملک تباہی کے کنارے پر کھڑا ہے۔ 1947ء والے مقام پر دوبارہ آنے کے لئے بہت صدیاں درکار ہوں گی۔

اللہ نے اپنے کرم سے ہمیں پاکستان کا خطۂ زمین، لا الٰہ الا اللہ کی صداقت کا زندہ و محسوس اور عملی ثبوت بہم پہنچاتے ہوئے قرآنی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے لئے عطا کیا تھا۔ 57 سال کے لمبے عرصہ کی مہلت ملنے کے باوجود ہم اپنا عہد پورا نہ کر سکے۔ 6 جنوری 2004ء سے ایسا نظر آتا ہے کہ اب مہلت کا وقفہ، گریجوایٹ اربابِ حکومت کے بھارت کے سامنے قیام کی بجائے سجدوں، دانشوران قوم کی اندھی بصیرت اور پاکستان مخالف حضرات کی امنگوں کے مطابق بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کی صورت میں پورا ہوا چاہتا ہے جس کی رو سے پاکستان کے حصول کا مقصد فوت ہو جانے کے ساتھ ساتھ کشمیر کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جائے گا اور نیوکلیئر اثاثے پر کاہ کی طرح ناکارہ ہو جائیں گے۔ ناامیدی گناہ ہے ابھی وقت ہے! اگر ہم چاہیں تو بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ سورۃ حج کی آیت نمبر 38 کے مطابق عملی طور پر قوانین خداوندی پر ایمان لانے سے اللہ کی طرف سے، ہر قسم کے شر و ہلاکت اور انسانی سپر پاور کی اسکیموں سے مدافعت ہو جائے گی۔